

پاکستان اور امریکی دستور

نعیم صدیقی

(۲)

اس تاریخ پر پس منظر کا مطالعہ کرتے ہوئے چند باتیں ذہن نشین کرنے کی ہیں :-
 ایک یہ کہ یورپ جس سیاسی شعور کی سطح پر اب پہنچ رہا تھا اس کے سرمبارہ سے امریکہ میں آغاز کار کیا جا رہا تھا۔
 یہ نوآباد کار باؤٹناہی اقتدار کے خلاف ایک بیزاری شروع سے لے کر چلے گئے جو کھلی فضاؤں میں بہت تیز رفتاری سے
 ان کے ذہنوں میں میکینا کا ڈراما چاہا جہاں ان کے دماغوں میں جان لاک، ہاس اور ٹیک اسٹون جیسے مفکرین کے
 نظریات گھر کیے ہوئے تھے۔ اور پھر برطانیہ کا غیر تحریری جمہوری دستور ان کے فرائس روح پر قسم تھا نیز جیسا کہ
 ہم اشارہ کر چکے ہیں ان کے خیالات کی دنیاؤں میں انقلاب انگیزان کے جس گونج رہے تھے۔ ان لوگوں میں
 آزادی کی حس روز بروز زور پکڑتی گئی اور بالآخر امریکی دستور میں یہ شہری حقوق کی مشہور دفعہ میں منعکس ہو گئی پھر جنگ
 آزادی کے دوران میں اصول نمائندگی پر جس طرح ان لوگوں نے زور دیا تھا وہ ایک نمائندہ حکومت کا مفروضہ بن گیا
 اس کی وجہ سے دستور میں رائے عام کو اہمیت حاصل ہوئی اور سیاسی نظم کا سنگ اساس عوامی ورڈ کو قرار دیا گیا
 دوسرے یہ کہ نوآبادیاتی ریاستوں کے درمیان رقابتی کشمکش کی جو تاریخ امریکہ کے سامنے تھی اس کی وجہ سے
 ناگزیر ہوا کہ ریاستوں کی داخلی آزادی کو ایک دوسرے سے محفوظ کر دیا جائے، لیکن دوسری طرف جنگ آزادی کے
 دور میں یہ احساس بھی زور پکڑ گیا تھا کہ مشترک مقاصد کے لیے ساری ریاستوں کو ایک مضبوط متحدہ طاقت پیدا کرنی ہے۔
 اس سے مذاق کا تصور پیدا ہوا۔

تیسرے یہ کہ یہ لوگ یورپ کے مذہبی اقتصادوں کی جس تاریخ سے گذر کر گونا گوں عقائد کو ساتھ لے یہاں آکر
 جمع ہوئے تھے اس کے تلخ تجربات نے ان کو مذہبی اختلافات کے معاملے میں ایک روادارانہ ماحول پیدا کرنے
 پر مجبور کیا خصوصاً حکومت کی طاقت کا اختلاف نے کو کچھنے میں استعمال ہونا نئی دنیا کے باشندوں کی نگاہ میں

مردود ٹھہرا۔ یہ دودھ کے جلے اب چھا چھ بھی پھونک پھونک کر مینا چاہتے تھے چنانچہ آزادی خیال اور آزادی اظہار رائے کو دستوری دائرے میں مختلف پہلوؤں سے محفوظ کرنے کا داعیہ ان لوگوں میں کار فرما ہوا۔

چوتھے یہ کہ استبداد (TYRANNY) کے خلاف ان کے اندر انتہائی سخت رد عمل موجود تھا، اور اس رد عمل کو بھی یورپ کی طویل فاسد تاریخ نے پیدا کیا۔ اس کے سدباب کے لیے انہوں نے ماٹیسکو (MONTESQUEU) سے ذہنی رہنمائی لی۔ وہ کہتا ہے :-

”آزادی کا کوئی وجود نہیں ہو سکتا اگر قانون سازی اور انتظام کے اختیارات ایک ہی فرد یا راجے کی ہوں۔ یا یہ کہ عدالت کا اختیار قانون سازی اور انتظام کے اختیارات سے منفک نہ کر دیا گیا ہو۔“

اس نظریہ کی روشنی میں انہوں نے دستور میں اس امر کا اہتمام کیا کہ یہ تینوں اختیارات بالکل الگ الگ الگ جایش، وہ محدود (LIMITED) ہوں اور ان کے درمیان توازن کار فرما ہو۔ کوئی اختیار ایک خاص حد سے آگے جا کر دوسرے اختیار کا مزاحم نہ ہو سکے اور جو نہی وہ تجاوز کرے دوسرا اختیار اپنے دستوری اور آئینی عمل سے اسے مقررہ حد پر روک دے۔ یعنی امریکہ کے دستوری ڈھانچے کو مخصوص ساخت دینے میں سب سے زیادہ بڑا حصہ اسی تقسیم اختیارات کے نظریہ کا ہے۔ امریکی دستور کے مطابق یہ نظریہ جس سسٹم پر کام کرتا ہے اسے نظام مزاحمت و توازنات (CHECKS & BALANCES SYSTEM) کہتے ہیں۔

پانچویں یہ کہ اس کو خیز سوسائٹی کے اعضا بڑے بڑے سرمایہ دار تا جبراً مذراعت کار اور معاشی لحاظ سے قسمت آزما لوگ تھے اور یہ ذہنی و سیاسی لحاظ سے اتنا پرمگیر تسلط رکھتے تھے کہ تمام سیاسی تعمیر میں ان کے مفاد کو اولیت حاصل رہی ہے اور دستور سازی میں ان کی جائداد و ملکیت کے تحفظ کا مسئلہ ایک مرکزی مسئلہ بنا رہا ہے۔ اس طبقے کا مفاد اگر زور نہ کر لیا ہوتا تو شاید فرد کو وہ حقوق ریاست کے مقابلے میں نہ مل سکتے جو موجودہ دستور نے دیئے ہیں۔

یہ ہے امریکہ کی دستور سازی کا تاریخی و ذہنی پس منظر! اسے سامنے رکھ کر امریکی دستور کو پڑھیے تو معلوم ہو گا کہ ایک ایک دفعہ کے اندر سے یہ پس منظر لبل رہا ہے۔ ایک ایک لفظ میں تاریخ حرکت کر رہی ہے۔ آخر

کیسے یہ ممکن ہے کہ اس طرح کی ذہنی فتنہ اور اس طرح کی تاریخ سے گزرتے بغیر کوئی توہین قوم ایک غیر متعلق نتیجے پر جا پہنچے۔ پاکستان کا دستور بناتے ہوئے ہم امریکہ سے اس کے ڈالروں کی طرح اس کی ذہنی و سیاسی تاریخ مستعار نہیں لے سکتے۔ ہمیں اپنی ذہنی و سیاسی تاریخ کو سامنے رکھ کر دیکھنا ہوگا کہ ہماری جنگ آزادی میں کونسے عوامل اور ہماری تحریک پاکستان میں کیا کیا محرکات کام کر رہے تھے اور یہ حیثیت مجموعی بجاری سو اہزار سالہ ملی تاریخ کی روح رواں کیا رہی ہے۔ ہم اپنے ہی ماضی سے پوچھ سکتے ہیں کہ ہمارا مستقبل کیا ہوگا۔ اپنا مستقبل ہم خود ماضی کے ماضی کی روشنی میں متعین نہیں کر سکتے۔ پاکستان کا دستور پاکستان کے اپنے ذہنی و تاریخی تقاضوں کو منعکس کرنے والا ہونا چاہیے نہ یہ کہ وہ دستور بنایا تو جاتے پاکستانیوں کے لیے اور ان میں ذہنی و تاریخی تقاضے کا نفاذ ہوں کسی دوسری دنیا کے!

اسی سلسلے میں بہت عذری معلوم ہوتا ہے کہ امریکہ کا دستور جن حالات میں، جن دماغوں کے تعاون سے اور جس طرح کی بحثوں کے نتیجے میں بنا ہے ان پر بھی ایک نظر ڈال لی جائے، یعنی دستور سازی کا ذہنی ماحول ہمارے سامنے ہونا چاہیے۔

امریکی دستور تدوین و تصویب کے مراحل میں | جنگ آزادی کی معرکہ آرائیوں سے گزر کر کامیابی کی منزل کو سامنے دیکھتے ہوئے امریکہ میں جو سیاسی شعور، جذبہ، اتام اور فیصلہ کن غریمیت کا رفرما ہوئی چاہیے تھی، تاریخ کا مطالعہ گواہی دیتا ہے کہ یہی صورت واقعہ بن کر موجود تھی۔ جو لوگ کسی انقلابی جدوجہد سے قربانیاں دے کر گزرتے ہیں ان کے اندر آہستہ آہستہ نظریاتی اور مقصدی یکسوئی پیدا ہو جاتی ہے، ان میں فیصلہ کن اقدامات کرنے کا کیرکٹر نمودار ہوتا ہے اور ان کو گاڑی کھینچ لے جانے والی قیادت مل جاتی ہے۔

وہاں ایک زوردار عوامی رجحان جبر و استبداد کے خلاف کارفرما تھا اور باوجودیکہ وہاں کثیرالتعداد و جداگانہ اور مستقل ریاستوں اور ان کے اندر بسنے والی مختلف نسلوں اور قوموں اور مذہبوں کی آبادیوں کو مشترک مقاصد کے لیے باندھ رکھنے والی ایک مضبوط حکومت کی ضرورت محسوس کی جا رہی تھی لیکن ساتھ ہی یہ اجتماعی تقاضا بھی کارفرما تھا کہ دفاعی حکومت کو یہ مقام نہ حاصل ہو جائے کہ وہ اپنی طاقت کو استبداد کے لیے استعمال کر سکے۔ استبداد کے خلاف یہ ہمہ گیر رجحان مثبت حیثیت سے عوامی راج (POPULAR RULE) کا

طالب تھا اور اسی کے لیے "نظریہ نمائندگی" کو اساسی حیثیت حاصل ہو کے رہی۔ نظریہ نمائندگی کا خلاصہ یہ ہے کہ حکومتوں کو جائزاً اختیار حکمرانی رعیت کی رضامندی سے حاصل ہوتا ہے۔ جس حکومت کو جب تک فرمانروائی میں رعیت کا تعاون اور اس کی رضامندی حاصل ہے وہ اس وقت تک ایک جائز حکومت ہے، اور جس حکومت کو جس وقت سے یہ تعاون اور یہ رضامندی حاصل نہ رہے وہ ایک جائز حکمران طاقت نہیں ہے اور اسے قائم رہنے اور کام کرنے کا حق حاصل نہیں رہتا۔

دستور سازی کا کام جن خارجی حالات کے درمیان شروع ہوا، مناسب ہو گا کہ تھوڑا سا تصور ان کا بھی دیا جائے، کیونکہ پاکستان کے حکمرانوں اور عوام کے لیے غم و سہمت کا ایک درس ان حالات کے مطالعہ میں موجود ہے۔ امریکہ کی مغربی سرحدات خطے کے عالم میں تھیں، کیونکہ ان کا قطعی تعین ابھی تک تحقیق و تصدیق کا محتاج تھا۔ برطانیہ اور برطانوی نوآبادیات اور یالینڈ اور دوسرے ممالک سے خارجی تجارت کا سلسلہ بار بار جنگی کارروائیوں کی لپیٹ میں آ رہا تھا۔ پورا تجارتی نظام بحران سے گزر رہا تھا۔ صنعتی سرگرمیاں زیادہ تر گھریلو پیمانے تک محدود تھیں اور مستقبل بالکل معلق تھا۔ گنتی کے اختیارات نکل رہے تھے اور ان کی اشاعت بھی محدود تھی۔ سرکاری نژاد تقریباً خالی تھا بلکہ ابھی تک کوئی قومی سکہ وجود پذیر نہیں ہوا تھا۔ پبلک کاغذات و فنر نزل تھا۔ ٹرکس نستہ حال تھیں، اور آمد و رفت اور رسل و رسائل کے ذرائع بہت ہی محدود اور کمزور تھے، یہاں تک کہ نیویارک میں کانگریس کا بحیثیت مقررہ جو پہلا اجلاس منعقد ہوا وہ ذرائع آمد و رفت کی خرابی کی وجہ ہی سے کسی ہفتے موخر ہو گیا۔ اسی کے ساتھ ساتھ یہ امر واقعہ قابلِ لحاظ ہے کہ تعلیم یافتہ آبادی کا تناسب بہت ہی کم تھا!

لیکن ان پیچیدگیوں اور مشکلات کے باوجود امریکی لیڈروں نے دستور سازی کو کبھی اس دلیل سے محروم ہونے میں نہیں ڈالا کہ چونکہ ہم ایک نئی قوم ہیں اور سخت حالات سے گزر رہے ہیں اور ہمیں ایک نئے طرز کا دستور بنانا ہے لہذا اس کام کے لیے ہمیں دس سال چاہئیں، اور نہ عوام ہی کو ضرورت پیش آئی کہ وہ دستور بنانے کے لیے پے درپے اپنی ٹیشن کریں کہ تعمیر نو کے لیے دستور بنانے کے دو امور کام کرنے کا تھا اسے مشکل حالات کے درمیان بیٹھ کر ہی سر انجام دیا گیا۔ لہذا دنیا کی ہر زندہ اور زندگی کے قابل اور آزادی کی مستحق قوم ناسازگار حالات کے اندر ہی سے آگے بڑھنے اور کام کرنے کے راستے نکالتی ہے۔

باقاعدہ دستور سازی کا کام تو بعد میں ہوا، لیکن اس کی بسم اللہ جون جولائی ۱۷۷۶ء ہی میں ہو گئی تھی جب کہ جنگ کی انتہائی اہمیت پر اپنا طبل بجا رہی تھی۔ اور موقع وہ تھا جبکہ برطانیہ سے جنگی طاقت کی ایک نئی کمیپ روانہ ہو چکی تھی۔ اس نازک لمحے میں خلاؤ لفیاء کے مقام پر ریاستی نمائندوں کی کانگریس میں ایک ریزولوشن پیش کیا گیا کہ رچرڈ ہنری لی (RICHARD HENRY LEE) کی طرف سے پیش ہوا جس میں یہ الفاظ تھے کہ :-

”یہ متحدہ نوآبادیات آزاد اور خود مختار ریاستیں ہیں اور ان کو ایسا ہونا چاہیے انہوں نے برطانوی تاج کی وفاداری کا قلم اہ اپنی گردن سے کیڑ نکال دیا ہے اور ان کے اور برطانوی تاج کے درمیان ہر قسم کا سیاسی رابطہ ختم کیا جا چکا ہے اور یا جانا چاہیے تھا“

ان الفاظ میں اس ذہنیت کا پورا عکس موجود ہے جو امریکہ میں پورا ان چرچوں کی تھی۔ ان سے آزاد ہونے کے جذبے کی بڑھتی جا سکتی ہے۔ ان الفاظ کے اندر وہ بیج ٹھوسے جا سکتے ہیں جن سے امریکی دستور کے بعدین ہم عناصر کی کوئٹیں پھوٹیں۔ ان میں وہ جرات مندی بول رہی ہے جس کے بغیر ایک نئے نظام کی نیرو نہیں نکالی جا سکتی۔ یہ حقیقت اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے اور اپنی دنیا آپ بنانے کا اعلان تھا۔ اور یہ پہلا سنگ میل ہے امریکی دستور کا!

ریاستی نمائندوں کے اسی تاریخی اجلاس میں اس ریزولوشن کے پیش ہونے کے دو روز بعد امریکہ کا مشہور اعلان آزادی لکھنا شروع ہوا۔ یہ ریزولوشن سے تعاقب کے انتقال کا قطعی فیصلہ تھا۔ اسی ریزولوشن کی رُو سے کانگریس کے نظام میں ریاستہائے متحدہ امریکہ (UNITED STATES OF AMERICA) کا نام اختیار کیا اور فرمائیے کہ یہ سب کچھ عین جنگی حالات میں ہو رہا تھا اور اس کے چند ہی عین بعد کانگریس کو برطانوی حملے نے خلاؤ لفیاء سے تشکیل باہر کیا۔

اعلان آزادی کے الفاظ کی صورت میں جو بیج بونے گئے تھے وہ ایک تناور دستور کی درخت کی صورت میں اس وقت جا کر رونما ہوئے جبکہ خلاؤ لفیاء باؤس ہی کے اندر ۱۷۷۶ء میں برطانوی کانگریس کا بطور دستور ساز ادارے کے اجلاس منعقد ہوا۔ یہ معلوم کرنا دلچسپی اور فائدے سے خالی نہ ہوگا کہ کس سطح اور صلاحیت کے لوگوں سے یہ دستور ساز کانگریس ترکیب یافتہ تھی۔ اس میں نیو انگلینڈ کے بڑے بڑے تاجر و وسطی ریاستوں کے

اعلیٰ جج، جنوبی علاقوں کے نمایاں زراعت کار شامل تھے اور ان کے اندر نصف تعداد ایسے لوگوں کی تھی جو یا تو ماہرین قانون تھے، یا اونچے سرکاری عہدوں پر کام کرنے کی وجہ سے دستوری اور قانونی ضروریات کا ماہرہ علم رکھنے والے تھے۔ کچھ گز رہ چکے تھے اور اعلیٰ علمی مرتبہ رکھتے تھے نصف تعداد یونیورسٹی کے گریجویٹ حذرت کی تھی۔ دو تہائی سے زیادہ تعداد ایسی تھی جو براعظمی کانگریس میں خدمات انجام دے کر تجربہ کار یا از مقام حاصل کر چکے تھے۔

اس عام تجزیہ کے ساتھ ساتھ دیکھنے کی چیز یہ بھی ہے کہ امریکہ کے کارہ دستور سازی کے لیڈر اور سربراہ مار کس دیے کے افراد تھے۔ ان میں درجہ اول کی شخصیت نروو شنگٹن کی تھی جو فرانس کے خلاف کامیاب معرکہ آرائی کرنے کے بعد جنگ آزادی کا مرکزی ہیرو بنا اور پوری پبلک کے دلوں میں اُس نے اپنی خدمات کے ذریعے خاص جگہ پیدا کر لی پھر وہاں فرینکلن، ہلٹن اور میڈیسن جیسے ذہین، متماز اور یا اثر افراد تھے جو بات کرتے تھے تو سنی جاتی تھی اور کسی چیز پر زور دیتے تھے تو ان کا زور مانا جاتا تھا، بحثیں کرتے تھے تو ان بحثوں سے کوئی نتیجہ پیدا ہوتا تھا۔ یہ ایسے لوگ تھے کہ اگر یہ اپنے اقتدار کو لوگوں پر ٹھونسنا اور اپنی بڑائی اور خداوندی کا دائمی تخت چھانا چاہتے تو شاید اپنے اثر و رسوخ کے بل پر ایسا کر لے جاتے۔ لیکن ان لوگوں نے اپنے اثر و رسوخ کا اپنا خیانت کھانا استعمال کرنے کا کبھی خیال بھی نہ کیا۔ یہ ایسا کرتے تو آج امریکہ کا یہ دستور اس شکل میں نمودار نہ ہوتا اور اس نئی دنیا کی مخلوق دنیا میں ایک ذلیل و خوار پراگندہ حال قوم کی صورت میں موجود ہوتی۔ تاہم میں وہاں فرینکلن جیسے لوگوں کے لیے ایسے مواقع ہو سکتے ہیں کہ وہ کسی نریب اور سازش کے پردے میں اپنی آمریت کا سکہ چلا لیں۔ اور اپنی گراں بہا خدمات کی قیمت اپنی ذات کے لیے وصول کر لیں۔ لیکن جن لوگوں کے پتے سرے سے کوئی ایک یادگاری کارنامہ بھی موجود نہ ہو، نہ جانے وہ کس برتے پر اس طرح کے خواب دیکھنے لگتے ہیں۔

اب دیکھیے کہ کن بحثوں کے درمیان دستور بنتا ہے۔ ان بحثوں میں ہم امریکی ذہن کو اچھی طرح پڑھ سکتے ہیں۔

۱۔ مناسب ہر گاہ کہ ان معلومات کی روشنی میں پاکستان کی سابق دستور پر اور اعلیٰ مخصوص نئی دستور کا جائزہ لے لیجیے۔

۲۔ گن کر بتائیے کہ ان میں دستوری و قانونی علم و تجربہ رکھنے والوں اور اعلیٰ درجہ کے تعلیم یافتہ لوگوں کا تناسب کیا ہے۔

۳۔ اس کے مقابل میں بتائیے کہ کون کون سا شنگٹن اور فرینکلن ہمارے بزرگوں کے درمیان موجود ہے کہ جو اپنے اثر سے قوم کو چاہیے منوانے

آراء کا اختلاف ہر ایسے تاریخی موقعے اور ہر ایسے مستقبل گیر کام میں رونما ہوا ہی کرتا ہے اور فلاڈلفیا کی مجلس میں بھی یہ کچھ کم نہ تھا۔ خیالات کا ایک سرالگزنڈ میلٹن (ALEXANDER HAMILTON) کی قدامت پسندی سے شروع ہوتا ہے اور اتنا تھا کہ حکومت کا نظام اشرافیت (ARISTOCRACY) کی صورت میں چلنا چاہیے اور دوسرا راجہ جیمز ولسن (JAMES WILSON) کی گرم جوشانہ آئیڈیل جمہوریت پر جا کر ختم ہوتا تھا جس نے اس بات پر زور دیا کہ عوام کی حکومت قائم کی جانی چاہیے۔ لیکن چونکہ ان لوگوں میں امریکیت کا ایک شعور قدیم تر تک تھا اور سب کے سب قانون کی عملداری اور ویل کے احترام اور فرو کی آزادی کے قائل تھے اس لیے جٹا جٹائی کے طویل مراحل سے گذر کر بالآخر ایک نقطہ پر سمجھوتہ ہو کر رہا۔

مئی ۱۷۸۷ء میں یہ لوگ جمع ہوئے، اور دستاویز کو صدر چننا گیا۔ اس کے بعد ۲۸ مئی کو کارولینا کے قدامت پس کیے گئے۔ ان ابتدائی پیروں سے گذر جانے کے بعد "جنیائی خاکہ" (VIRGINIA PLAN) مدراجت بن کر سامنے آیا۔ یہ خاکہ دراصل نپیدہ قراردادوں پر مشتمل تھا جن میں بیشتر میڈین کے دماغ کی مرتب کردہ تھیں اور انہیں گورنر ایڈمنڈ رینڈولف (EDMUND RANDOLPH) نے پیش کرنے کا آغاز کرتے ہوئے اپنی ناقدانہ تقریر کے ذریعے بحث کی گیند کھلاڑیوں کے سامنے لڑ سکاوی۔ جنیائی خاکہ ایک ایسی مضبوط قومی حکومت کے تصور پر مبنی تھا جو ایک انتظامیہ، ایک عدلیہ اور ایک مقننہ پر مشتمل ہو اور مؤخر الذکر ادارہ کی دو شاخیں ہوں، ایک آناؤنٹروں کی انتخاب، کردہ اور دوسری ریاستی ایوانوں کی منتخب کردہ! اس سے خیالات کی آویزش بڑے زور سے شروع ہوئی۔ تاہم اصل کچھ جمہوریت اور ریاستوں کے حقوق کے دو مسئلوں پر مرکوز ہو گیا۔ کیا عوام کو اپنے نمائندے منتخب کرنے چاہئیں؟ کیا لوگ حکومت خود اختیاری کے اہل ہیں؟ اگر ان کو ووٹ کا حق دیا جائے تو کیا یہ نخلہ نہ ہوگا کہ غریبوں کا اکثریت چن لیں اور ثروت کو میدان سے دھکیل باہر کرے اور سب سے ملکیت کا حق متزلزل ہو جائے؟ کیا یہ انبہ نہ ہوگا کہ دولت، تعلیم اور معاشرتی مرتبہ رکھنے والے شرفاء کو کار حکمرانی سونپا جائے؟ یہ تھے نہایت درجہ کی گرما گرم بحث پیدا کرنے والے سوالات! دوسرے درجے پر ریاستوں کی پوزیشن کا مسئلہ تھا کہ بڑی اور چھوٹی ریاستوں کے درمیان تعلق کی نوعیت کیا ہوگی؟ کیا یہ صحیح ہوگا کہ ڈیلواور (DELAWARE) کی ننھی سی ریاست کو انٹرنیشنل نمائندے بھیجنے کا حق دیا جائے

جتنے کہ درجینڈیا اور میساچوسٹس جیسی کثیر آبادی رکھنے والی ریاستوں سے لیے جائیں؟ اور اگر ایسا نہ کیا جائے تو کیا چھوٹی ریاستوں کو یہ خطرہ نہ ہو گا کہ بڑی ریاستیں ان کو دبا لے جائیں گی؟

قاعدہ کی بات ہے کہ تاریخی حالات اور تمدنی اسباب اور نظریاتی عوامل جب کسی خاص فکر و مقصد کو ابھار کر عملی شکل پانے کی حد پر لے آتے ہیں تو ان کے بارے میں رد و عمل بھی ایک بار پوری بھرک کے ساتھ رونما ہوتا ہے۔ نئی تعمیر کا سنگِ اساس رکھتے چلیے تو اسے روکنے والی طاقت بھی پیچ و تاب کھا کر سامنے آجاتی ہے۔ یہی امریکہ میں ہوا۔ ایک طرف آزادی اور جمہوریت کا ہمہ گیر رجحان تھا جو ایک نظامِ سیاست و تمدن کی شکل پانے کے لیے ابھریا تھا۔ اس کے مقابلے میں دوسری طرف سے آزادی و جمہوریت کے مخالف ماضی پسندوں اور قدامت پرستوں کے اندر جو کچھ بھی رجحانات کا زور ہاتھ وہ ایک بھاری منشی تھوڑے بن کر ایوان میں مبارزت کے لیے کود گئے۔ مشہور دولت مند ایل بریج گیری (ELBRIDGE GERRY) جو ان میں بولا:

”تمام نمایاں جن سے ہم دوپار ہیں، خدا سے بڑھتی ہوئی جمہوریت کے سرچشمے سے نمودار ہوتی ہیں“

گورنر نیو یارک (GOUVERNEUR MORRIS) نے کہا: ”انہی انہی تھے۔“

”عوام دلیل کے تحت ہی کام نہیں کرتے بلکہ زیادہ علم رکھنے والے لوگ ان کو اڑنا بیٹھے ہیں“

انگریز پبلشر نے اس پر اور روروا رکھا کہ:

”عوام راستے قائم کرنے اور فیصلہ دینے میں تازہ ہی صحیح ہوتے ہیں!“

دوسری صفحہ جو جمہوریت کی علمبردار تھی اس میں نمایاں حیثیت کے گل ٹین یا چارلز فرانسس تھے۔ انہی میں سے

جو جارج مین (GEORGE MASON) نے بالائی طبقوں کی خود غرضی اور انسانی ضروریات

سے بے نیازی پر اٹھنا بخیال کرتے ہوئے یہ اپیل کی کہ ہمیں تمام طبقوں کے لوگوں کے حقوق پر توجہ دینی چاہیے۔

جیمز ہسن نے اپنے قانونی داغ کے سائے زور کے ساتھ حق رائے دہی کی توسیع کا مطالبہ کیا اور اصرار کیا کہ

مقتضیٰ کے ایک ایوان کو تو لازماً انتخابی ہونا چاہیے۔ اس نے استدلال کیا کہ:

”کہوٹی حکومت بغیر عوام کے اعتماد کے زیادہ دیر تک نہیں چل سکتی!“

جیمز میڈیسن بولا:

”وہ زیادہ مضبوط اور دیر پا اسی صورت میں ہو سکتی ہے جبکہ اس کا دار و مدار خود عوامیت کی مضبوط

بنیاد پر ہو۔“

پھر مینجمنٹ فریگیٹن تھا، جو عوام سے خود فرزدہ نہ تھا اور مکمل جمہوریت پر نشین رکھتا تھا اور چاہتا تھا کہ ہر شخص کو ووٹ دینے اور حکومت کو منتخب کرنے کا حق ہو نا چاہیے۔ اس کی تقریر کا یہ اقتباس دیکھیے:-

”ہمیں اپنے عام لوگوں کی ملبندی کر دار اور اجتماعی روح کو دباننا نہیں چاہیے، جس کے بل پر انہوں نے

جنگ آزادی کے دوران میں بڑی شاندار بازیماں کھیلی ہیں اور جس نے اس جنگ کے شہرہ روزگار منتہا و

مقصود کو بنانے میں حصہ لیا ہے۔“

اس جملے میں استدلال یہ ہے کہ عوام اگر جنگ آزادی کو لڑ کر اسے جیت لینے کی صلاحیت رکھتے ہیں تو وہ اپنے اوپر حکومت کرنے کے بھی اہل ہو سکتے ہیں۔ ان بحثوں سے گزر کر خیالات ایک معتدل سرحد پر آ کر جمع ہونے اور وہی معتدل سرحد امریکہ کے دستور کی شکل میں آپ کے سامنے ہے۔

اسی طرح ریاستوں کی پوزیشن پر کئی ہفتے کی دماغی کشتی کے بعد سمجھوتہ ہو گیا اور طے پایا کہ ریاستی ایوان یعنی (SENATE) کو چھوٹی بڑی ریاستیں مساوی نمائندگی کے اصول پر تشکیل دیں گی، اور ایوان نمائندگان میں نمائندگی تناسب آبادی کے لحاظ سے ہوگی۔ اس طرح وفاق نظام کا دو ایوانی سسٹم پیدا ہو گیا۔

۱۷۷۶ء میں اعلان آزادی سے جس نئے دستور کی نیوٹری تھی، یوں اس کی تکمیل دس گیارہ برس بعد

۱۷۸۷ء میں ہوئی۔

دیکھیے، آپ کو ان بحثوں کی پوری تفصیل کے مطالعہ میں کہیں بھی بیڈیل رجمان کام کرتا نہ ملے گا کہ امریکہ والے اپنا دستور بناتے وقت کسی دوسری نامور سلطنت یا بڑی قوم کے دستوری ڈھانچے کو بھکاریوں کی

سلہ پاکستان میں جن لوگوں نے عوام کے خلاف بے عوامی کے جذبے کے ساتھ مخالف جمہوریت جہالت کا علم لٹو دیا وہ کبھی

کے حوالان سے بند گیا ہے، فریگیٹن کا جواب ان کے لیے بھی کافی ہے۔ ملت پاکستان کے عام لوگ اگر انگریزی امپریزم اور ہندوستانی متحدہ قومیت کے خلاف کامیاب جنگ لڑ کر پاکستان حاصل کرنے کے اہل تھے تو وہ اپنے معاملات کو خود چلانے

کے اہل بھی ہو سکتے ہیں، بشرطیکہ کوئی نااہل قیادت ان کا راستہ روک کر نہ کھڑی ہو جائے۔

طرح لپچائی نظروں سے دیکھ رہے ہوں۔ یا ان میں تقالی کی نسبت ذہنیت کام کر رہی ہو، یا وہ کسی دوسری طاقت کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے یا کسی کے خفا ہو جانے کے ڈر سے بدحواس ہو رہے ہوں، یا وہ اپنے دستوری مسائل پر غیر مآکاب میں جا جا کر اور باہر سے ماہرین کو بلا بلا کر ان سے رہنمائی حاصل کر رہے ہوں۔ ایک قوم نے اپنی ضروریات اور سامنے رکھ کر اپنی تاریخ کے دائرے میں رہتے ہوئے اپنے ذہنی رجحانات کے تحت اپنے آزاد داغ سے سوچا اور اپنے نظریات و مقاصد کے مطابق بالکل ایک نیا دستوری ڈھانچہ پیدا کر دیا۔ اور یہاں یہ حال کہ صاف صاف پبلک میں کہا جاتا رہا ہے کہ ہم اپنے ملی نظریات اور عوامی رجحانات کے مطابق دستور بنا ڈالیں تو دنیا کی فلاں اور فلاں سلطنت بگڑ جائے گی، اگر ہم کامل استقلال کا مقام پیدا کر لیں گے تو فلاں قوم اور ڈسٹر آرڈر ٹھک جائے گا۔ یہاں قرار دو مقاصد کے پاس ہونے پر یہ تنگ کہا جاتا ہے کہ اسے لے کر ہم دنیا کو کیسے منہ دکھائیں گے۔ یہاں محنتوں کا موضوع یہ بنتا ہے کہ کس قوم سے کیا اصول و مقاصد اور کس ریاست سے کیسا ڈھانچہ ہمیں اٹھانا چاہیے۔ یہاں باہر جا جا کر خفیہ طور پر اغیار سے گفت و شنید کی جاتی ہے کہ اگر ہم یہ امدید اقدام کریں تو تم لوگ بگڑو گے تو نہیں اور یہاں بیرونی طاقتوں کو تسلی دلائی جاتی ہے کہ ہم تمہارے نقش قدم کو چھوڑ کر اور کسی طرف رخ کرنے والے نہیں ہیں۔

وہاں پہلا قدم یہ تھا کہ تاج برطانیہ سے ہم کا ملا قطع تعلق کرنے میں اور یہاں سات اٹھ برس کی دستوری آوارہ گردی کے بعد ہم پھر اس مقام پر پہنچے ہیں کہ ہمارا سب سے بڑا انتظامی حکمراں ملکہ برطانیہ کا خلیفہ فرمانڈ ہے۔ وہاں ذہن یہ تھا کہ فرد واحد کی خدائی نہ چلنے دی جائے گی اور یہاں نقشہ یہ ہے کہ عوام کی نماندہ دستوریہ بالاتفاق جو کچھ پاس کر دے اسے فرد واحد بہ یک جنبش قلم محو کر دے سکتا ہے، بلکہ جب چاہے سرے سے دستوریہ کا اڈہ ہی اٹا دے سکتا ہے۔ وہاں آزاد ذہن سے اپنی ضروریات کی روشنی میں ریاست کی نیوٹوالی جاری رہی تھی اور یہاں غلامانہ زاویہ نظر ہے جو قوم کے بجائے اپنے ذہنی آقاؤں کی خوشنودی کے درپے ہے۔ وہاں ایک دستوری ڈھانچہ تخلیق کیا جا رہا ہے اور یہاں بھی پرکھی ماری جا رہی ہے۔ پہلے برطانیہ کی مکھی پرکھی مارنے کا معمول تھا، اب جدت و اجتہاد نے بہت بڑی زقند لگا کر یہ دعوت دی ہے

کہ برطانیہ کو چھوڑ کر امریکہ کی کبھی پرکھی مارو!۔ مگر وہ بھی صرف ایک صدیقی اختیار کی قدر تک، صرف ایک ملکہ کبھی کے معاملے میں!

اب ہم آئندہ سطور میں امریکی دستور کا تجزیہ کر کے یہ دکھانا چاہتے ہیں کہ وہ کن اجزائے ترکیبی سے بنا ہے جو ہم دگر مل کر ہی مطلوبہ نتائج پیدا کر سکتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہم یہ بھی واضح کریں گے کہ امریکی دستور کے ڈھانچے میں صدر کے اختیارات جیسے کچھ بھی ہیں وہ کیوں ہیں اور ان اختیارات کو انضباط میں رکھنے کا کیا انتہام کیا گیا ہے؟ نیز ان اختیارات کے مقابل میں دوسرے ادارے ریاست کو اور خود عوام کو کیا طاقت دی گئی ہے۔

تحریری دستور امریکہ کی دستوری بیعت کا تجزیہ و مطالعہ کرنے چلئے تو اولین چیز جو ایک طالب علم کو متوجہ کرتی ہے وہ دستور کا عام قانون سے الگ ایک دستاویز کی صورت میں موجود ہونا ہے۔ یہ تو معلوم عام بات ہے کہ موجودہ دور تمدن و سیاست کا یہ سب سے پہلا تحریری دستور ہے جو آہستہ آہستہ تجربوں سے گزر کر اور عملی روایات سے سیراب ہو کر پروان نہیں چڑھا بلکہ امریکی پدرانہ دستور نے عالمی نظریات و تجربات کی روشنی میں مشترکہ کاوشوں سے اسے بیک دم وجود دیا ہے اور بعد میں بہت ٹھوس سی ترامیم اس میں ہوئی ہیں۔ (یوں ہم کو اس بات سے سخت انکار ہے کہ یہ جملہ تاریخ انسانی کا پہلا تحریری دستور ہے، کیونکہ ہمارے سامنے ناقابل تردید صورت میں تحقیق موجود ہے کہ دنیا کا پہلا تحریری دستور مدینہ کے اسلامی اشعبہ نے پیش کیا ہے)۔ اس موضوع پر سرچیں تو ایک سوال یہ پیدا ہوا ہے کہ دستور کی ماہیت، ضرورت اور تعریف کیا ہے؟ آئیے لارڈ برائیس (LORD BRUCE) سے اس کا جواب سنیں:-

”دستور ایک ایسی بیعت اجتماعیہ کا ڈھانچہ ہے جو قانون کے واسطے سے اور قانون کے ماتحتوں کے تشکل ہوئی ہو، دوسرے لفظوں میں ایک ایسی بیعت جس میں قانون نے مسلمہ مقاصد اور متعین حقوق کے ساتھ ساتھ مستقل ادارت کو برپا کر دیا ہو“

جی۔ ایف۔ سٹرانگ (G.F. STRONG) بتاتا ہے کہ:-

”دستور کو چند ایسے اصولوں کا مجموعہ قرار دیا جاسکتا ہے جن کے ذریعے حکومت کے اختیارات اور رعایا کے حقوق اور پھر ان دونوں کے باہمی روابط کو متعین کیا جاسکے“

• دستور کا مدعا مستبدانہ اختیار کو محدود کرنا، یا بالفاظ دیگر رعایا یا کم سے کم اس کے کسی حصے کو

کچھ خاص حقوق کی ضمانت جو پہنچانا ہے۔“

• ایک سیاسی دستور جہاں کہیں بھی یہ پایا جائے، پھر حال ایک ہی مدعا رکھتا ہے، یعنی اجتماعی امن و

ترقی اور فرد اور قومی بہبود کا تحفظ!

یعنی دستور کے ہونے کے معنی یہ ہیں کہ قانون کسی نظام ملکی میں ایک قوی عامل کی حیثیت رکھتا ہو، حکمران قوت

کے انتہائی تہ، غیر محدود نہ رہیں اور وہ مسئول ہو جائے، نیز رعایا کے کچھ متعین حقوق ہوں اور ان کی حفاظت کی

ضمانت دی گئی ہو، اور یہ کہ سیاسی نظم کو چلاتے کے لیے مستقل ادارت وجود میں لائے گئے ہوں جو قانونی خطوط

پر کام کریں۔

سنا، بظاہر ہے کہ دستور کی اس ماہیت، و ضرورت اور اس تعریف کے پس منظر میں جمہوری تخیل کا فرما ہے۔

اور جمہوریت کی مختلف لمبی چوڑی تعریفیں اور اس کے گونا گوں تعارضوں سے صرف نظر کر کے اگر اس کا مرکزی جوہر

سامنے لایا جائے تو ایک صاحب فکر کے بقول اس کی ماہیت، یہ ہے کہ:

• حکومت کا دار و مدار رعایا کی عملی رضامندی پر ہوا!

پس کسی تحریری دستور کی اسلئے اس دور میں جمہوری تخیل ہے جو قانون کی طاقت کو حاکم اور محکوم کے

درمیان حقوق و ذرائع کی تقسیم کرنے والا توازن برآء کے بٹھاتا ہے۔

لارڈ براٹیس کے نقطہ نظر کی مزید توضیح کرتے ہوئے جی، ایف، ہٹرانگ نے اپنی تصنیف ”جدید سیاسی دستاویز“

(MODERN POLITICAL CONSTITUTIONS) میں بڑی کام کی باتیں کہی ہیں۔ سب سے پہلے تو وہ یہ بتاتا ہے کہ:

• ”تحریری دستور ایک ترقی یافتہ ریاستی شعور کا مظہر ہوتا ہے جو حکومت کے مروج طریقوں کے تعاقب

کا ازالہ کرنے کے لیے نمودار ہوا کرتا ہے۔“

پھر وہ حالات کی چار ذمہ داریاں ہمارے سامنے لاتا ہے جن میں سے کسی ایک کے اندر تحریری دستور کی شکل پانا ہے

پہلی صورت یہ کہ شہری۔۔۔۔۔ اپنے حقوق کو ختم کرے میں پا کر ان کے بچاؤ کے لیے اٹھ کھڑے ہوتے

ہیں اور حکمران طاقت کو اس کے اقدامات سے روک دینا چاہتے ہیں۔

دوسری صورت یہ ہوتی ہے کہ حکومت کے مروجہ نظام کو ایک غیر متعین شکل میں پاکریا تو رعایا کی طرف سے تقاضا ہوتا ہے اور یا حکمران اپنی رعایا کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے بطور خودیہ اقدام کرتا ہے کہ مستقبل کے لیے سیاسی ہیئت کو ایسے مستقل حدود و اثرات کے ساتھ دستوار کیا جائے کہ مستبدانہ کارروائیوں کی گنجائش باقی نہ رہے۔ تیسری صورت یہ ہوتی ہے کہ بالکل ایک نئے معاشرے یا نئی ریاست کو تشکیل دیتے ہوئے اس کے باقی اور اراکین اور شہری کوئی ایسا نظام حکومت اختیار کرنا چاہتے ہیں جو دیر پا ثابت ہو سکے اور باشندوں کے لیے قابل قبول ہو۔

چوتھی صورت یہ ہوتی ہے کہ چند متفرق طور پر پائے جانے والے معاشرے اپنی جداگانہ ہستی کو برقرار اور اپنے حقوق و مفادات کو محفوظ رکھتے ہوئے بعض مشترک ضروریات کے لیے مل کر کام کرنا چاہتے ہیں۔ پہلی صورت میں کسی بادشاہ کے نافذ کردہ فرمان کے ذریعے، دوسری صورت میں انقلابی عمل کے ذریعے مروجہ نظام کو توڑ پھینکنے سے، تیسری صورت میں کسی نئی ریاست کی تشکیل کرنے والے نمائندوں کے مشورے سے اور چوتھی صورت میں ڈھیلا ڈھالا رابطہ اتحاد رکھنے والی ریاستوں کے باہمی سمجھوتے سے تحریری دستور نمودار ہوتا ہے۔

امریکہ کا تحریری دستور دوسری اور چوتھی دونوں صورتوں کے مشترک عمل سے وجود میں آیا ہے۔ ابتدائی تیرہ ریاستوں نے انقلابی اقدام کر کے اس بندھن کو کاٹ پھینکا جس نے انہیں برطانوی تاج سے باندھ رکھا تھا، نو آبادیاتی نظم میں جکڑ رکھا تھا۔ چنانچہ ایک تحریری دستور کی بنا اعلان آزادی سے پھر گئی۔ ان تیرہ ریاستوں کو بعد میں آٹھ نئی ریاستوں نے جنگی صورت حالات کے تقاضے سے ایک تحالفی رابطہ (CONFEDERATION) پیدا کر لیا جو آگے چل کر نئی ضروریات کے تحت جب فیڈریشن کا شکل اختیار کرنے لگا تو مرکز اور ریاستوں کے حقوق کے تعین کے لیے ایک مکمل تحریری دستور وجود میں آیا۔

پس تحریری دستور ہونے کی وجہ سے امریکی نظام ریاست میں حسب ذیل خصوصیات، کاروبار اور دیگر امور کا تنظیمی ایک یہ کہ حکمران طاقت کے اختیارات اور عوام کے حقوق، نیز دفاعی مرکز اور ریاستی و اعزہ ہوت کے حقوق و اختیارات ایک دوسرے کے بالمتقابل متعین ہیں۔

دوسرے یہ کہ حیثیت سیاسی قانون کے قائم کردہ ادارت کی صورت میں بالکل متعین اسلوب سے کام کرتی ہے جس میں مستیدانہ اختیارات کو مدخلت کا اذن حاصل نہیں ہے۔

تیسرے یہ کہ حکمران طاقت اور عوام، نیروغاتی مرکز اور ریاستی واحدہ جات کا باہمی رابطہ قانون پر مبنی ہے اور قانون ہی کی طاقت ان کے درمیان بالادست قاضی کی حیثیت رکھتی ہے۔

اب ہم پاکستان کی صورت حالات پر اگر غور کریں تو باوقل نظر اد پر کی بیان کردہ صورتوں میں سے تیسری صورت میں درپیش ہے یعنی ہم ایک نئے معاشرے یا ریاست کی حیثیت سے منصفہ شہود پر جلوہ گر ہوئے ہیں ایسی صورت میں دیکھے جانے کی چیز یہ ہے کہ ہمیں جداگانہ ہستی دلوانے والا سیاسی شعور کیا تھا اور اس کا اندر کیا تقاضے مضمر تھے۔ ظاہر ہے کہ تحریک پاکستان کے پیچھے کام کرنے والے سیاسی شعور میں دو تقاضے پوشے زور سے کار فرما تھے :- ایک غیر ملکی اقتدار کی غلامی سے نجات تاکہ ہم غیروں کے مفاد کی شکار گاہ ہونے کی پوزیشن سے نکل کر آزاد ملت کی حیثیت سے زندگی کی تعمیر کر سکیں۔ دوسرے ہندو اکثریت کے تسلط سے نجات تاکہ ہم اپنی آئیڈیالوجی کے مطابق ایک معاشرہ و تہذیب کی بنا کر سکیں پس ہمیں انہی تقاضوں کی روشنی میں دستور کے مسئلے پر غور کرنا ہے لیکن اپنی آئیڈیالوجی کو کوئی دستوری قالب بنا کے دیتے ہوئے ہمیں دنیا بھر کے تجربات سے نائدہ اٹھانا ہے اور یہ دیکھنا ہے کہ کس شکل میں ہمارا نظام زیادہ دیر پا ہوگا اور ہمارے عوام کے لیے پسندیدہ و قابل قبول!

لیکن یہاں ایک لحاظ سے پہلی صورت بھی درپیش ہے۔ سابق دستوری نظام جو جزائی انقلاب کے واقع ہو جانے کے بعد بھی مسلسل آٹھ برس جاری گردنوں پر لدا چلا آ رہا ہے، اس کے خلاف ہمارے اجتماعی ذہن میں اس وقت ایک نفرت براب نشوونما پاتی چلی آئی ہے جبکہ آزادی کے جذبے نے مسلمانوں کے اندر پہلی گروٹ لی تھی۔ ہمارا بچہ بچہ محسوس کرتا ہے کہ اس دستوری نظام میں ان کو سرے سے وہ کم سے کم حقوق ملی حاصل نہیں ہیں جس کے بغیر کسی تہذیب قوم کے وجود کا تصور نہیں کیا جاسکتا۔ پھر آزادی کے موسم بہار کے آجمنے کے بعد ہمارے ذہن کے اپنے ہی مایوں نے گلچینی و سیاوی کے جو باختر بڑھ بڑھ کے ماسے ہیں، اس مثبت سالہ تجربے کے بعد تو ایک ایک چھول اور ایک ایک تھری مضطرب ہے۔ آزادی سے پہلے ہی اس پوزیشن سے نکلنے کا جذبہ رہا تھی۔